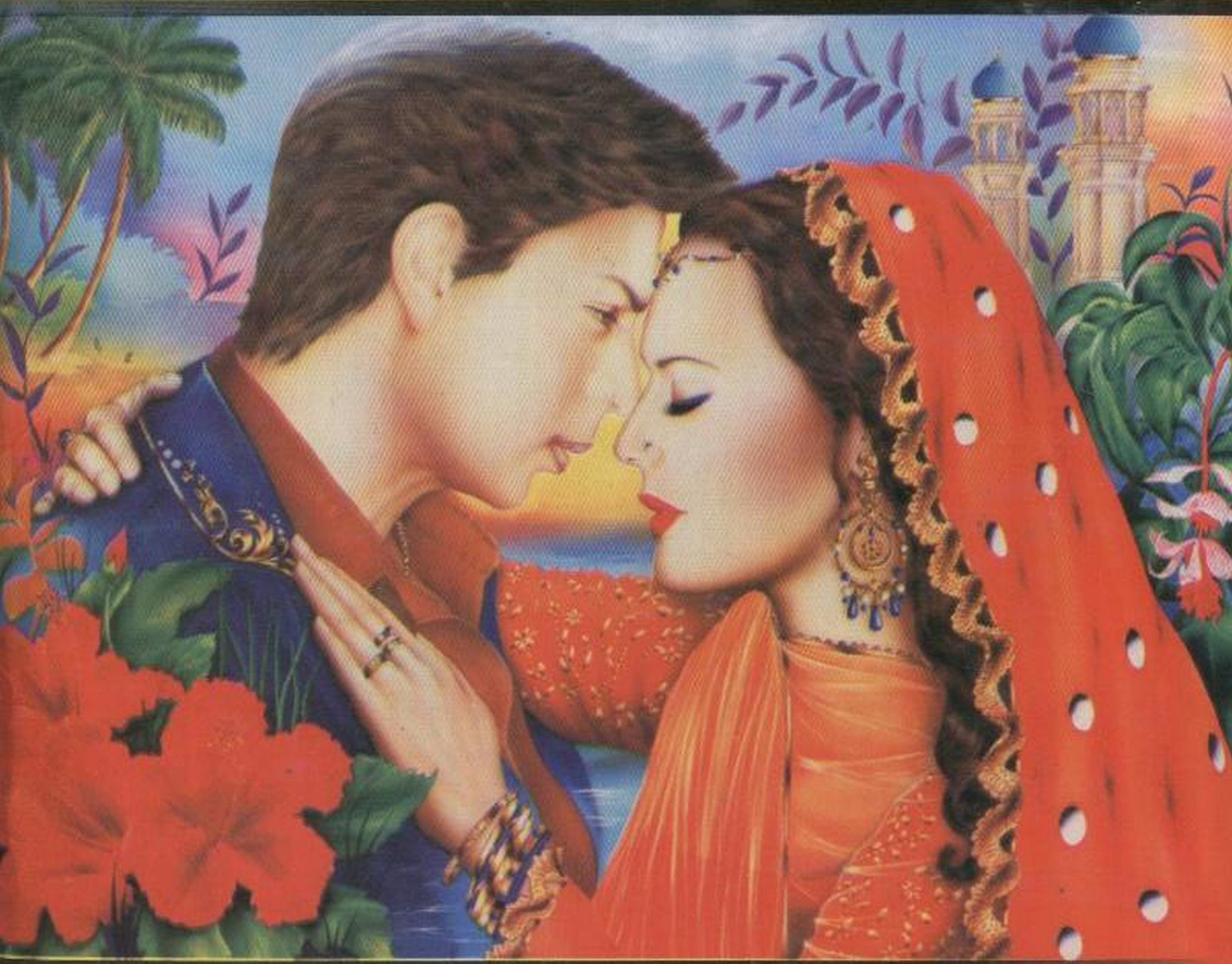


میرے سہاجن



اقبال بانو

میرے ساجن !.....!

جتنے رنگ ہیں دھنک کے
اتنے رنگ ہیں تیرے
میرے ساجن !.....!

جتنی خوشبو ہے پھولوں میں
اتنی خوشبو ہے تیری
میرے ساجن !.....!

جتنے موسم ہیں سال میں
اتنے موسم ہیں تیرے
میرے ساجن !.....!

جتنی چاہت ہے دنیا میں
اتنی چاہت ہے تیری
میرے ساجن !.....!

جتنے رت جگے ہیں آنکھوں میں
اتنے خواب ہیں تیرے
میرے ساجن !.....!

جتنی آرزو ہے دل میں
اتنی حسرت ہے تیری
میرے ساجن !.....!

اقبال بانو

میرے ساجن

بارش کی کوئی بوند تھی یا اھکِ ندامت
اس شوخ کی پلکوں پہ نگینہ سا جڑا تھا

آسمان سُرمئی گھٹاؤں سے سجا ہوا تھا اور گھٹائیں بھی دل کھول کر برس رہی تھیں۔ کبھی
کبھی بجلی زور سے کڑکتی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔
موسم کی پہلی بارش تھی، اور ساتھ ہی ساون کی بھی پہلی بارش۔ اوپر سے مزے کی
بات یہ تھی کہ بقول دادی اماں کے
”جمہرات کی جھڑی ہے، پورا ہفتہ رہے گی۔“
”ضروری ہے دادی ماں !.....؟“
ماورا نے مسکرا کر کہا۔

”تم دیکھنا، ایسا ہی ہوگا۔“

انہوں نے اپنے پوپلے منہ سے نہایت ہی وثوق سے کہا تھا، اور اب اس نے جان لیا
تھا کہ یہ جھڑی پورا ہفتہ رہے گی کیونکہ تیسرا دن تو تھا اس برستے مینہ کو جس میں نہانا اسے ہمیشہ
پسند تھا اور اس بار تو اسے سوچنا اچھا لگ رہا تھا۔

بس دل چاہتا وہ ”شیری“ کے بارے میں سوچے۔ یوں بھی اس کی سوچوں کے
اوطاق پر ”شیری“ ہی کے نام کے دیے جل رہے تھے۔ اس کی سوچیں ان دیوں کی کو تیز سے

تیز تر کر دیتی تھیں۔

اسے شیرے کے بارے میں سوچنا اچھا بلکہ بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ درتچے سے ٹیک لگا کر باہر برستے مینہ کو دیکھتے ہوئے وہ شیرے کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کی کئی شکلیں بناتی۔

”پتا نہیں وہ کیسا ہوگا.....؟“

اس نے ابھی تک اسے دیکھا نہ تھا مگر دل میں اس کی محبت کا ننھا سا پودا اُگنے سے نہ روک سکی تھی، اور وہ جو مستقبل کی پلاننگ کرتا تو ہر قدم پر وہ خود کو شیرے کے ساتھ پاتی تھی۔ وہ شہر یا ر یعنی شیرے بالکل غیر محسوس طریقے سے اس کے دل میں اُتر گیا تھا اور یہ زیادہ دنوں کی تو بات نہ تھی، صرف چھ ماہ قبل جب وہ رات کو مووی دیکھ کر سونے کے لئے اپنے کمرے میں جانے لگی تھی تو فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ تب فوزیہ آپا نے کہا تھا۔

”بھئی ماورا.....! میرا فون ہو تو کہہ دینا، میں سوئی ہوئی ہوں۔ لوگوں کو رات کے وقت بھی چین نہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے فون کرنے کا.....؟“

وہ بڑبڑاتی ہوئی زینے کی جانب بڑھ گئیں اور ماورا نے ریسیور اٹھا لیا۔ بے اختیار اس کی گھڑی پر نظر گئی تھی جہاں پونے ایک کا وقت تھا۔

”جی.....!“

”ہیلو.....! السلام علیکم.....!“

مردانہ بھاری آواز ماورا کے کانوں میں اُتری۔

”وعلیکم السلام.....! کس سے بات کرنی ہے جی.....؟“

”آپ سے.....!“

”وہاٹ.....؟“

”ہاں بھئی.....! میں اس وقت بہت جھکن محسوس کر رہا ہوں اور اب ہر صورت کسی

سے بات کر کے فریش ہونا چاہتا ہوں۔“

”سوری.....! میرے پاس فضول وقت نہیں ہے، فضول لوگوں کے لئے.....!“

اس نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔ عجیب بدتمیز آدمی ہے۔ غصے سے اس کا دماغ

کھولنے لگا تھا۔ دوبارہ کھنٹی بجی تو اسے ریسیور اٹھاتے ہی بنی کہ اسے علاوہ کوئی ”اہم“ فون

بھی ہو سکتا تھا۔

”جی.....!“

”پلیز.....! فون بند نہ کریں۔“

نہایت لجاجت سے کہا گیا۔

”دیکھیے مسٹر.....“

”شیری.....! شہر یار.....!“

اس نے نام بتایا۔

”میں نے آپ سے نام نہیں پوچھا۔“

”میں نے سوچا، آپ میرے نام ہی سے پکھل جائیں شاید.....!“

وہ بے ساختہ تو اس کے انداز پر ماورا کو ہنسی آگئی جسے اس نے مشکل سے دانت بھیج

کر دیا۔

”دیکھیں، آپ اچھے بچوں کی طرح سو جائیں۔“

ماورا نے اسے مشورہ دیا۔

”میں تھکا ہوا ہوں، مجھے نیند نہیں آئے گی۔“

”پھر چائے پی لیں.....!“

”اس وقت مجھے کون چائے بنا کر دے گا.....؟“

”کیوں.....؟ گھر والے مر گئے ہیں کیا.....؟“

”گھر والے یہاں نہیں ہیں۔ میں ہاسٹل میں رہتا ہوں۔“

”اوہ.....!“

ماورا کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کہے.....؟

”اب ترس آیا.....؟“

اس نے پوچھا۔

”مجھے ایروں غیروں پر ترس نہیں آتا۔“

”اب ہم ایرے غیرے کب ہیں.....؟“

وہ لہکا۔

”کیوں نہیں ہیں.....؟“

”اب تو ہم بات کر رہے اور بات کرنے میں آپ کا کیا جاتا ہے.....؟ یوں بھی کل میرا ٹیسٹ ہے، میں خوب صورت، کوئل آواز سن کر فریض ہو کر سونا چاہتا ہوں، پتا ہے کیوں.....؟“

”کیوں.....؟“

بے ساختہ وہ پوچھ بیٹھی تھی۔

”تاکہ خوب صورت خواب دیکھ سکوں۔ مجھ سے بات کریں ناں.....!“

”منہ دھور کھیں.....!“

ماورا نے کہا اور فون بند کر کے ساتھ ہی پن بھی نکال دی تاکہ آرام سے جا کر سو رہے۔ اسے یوں بھی ڈر لگ رہا تھا کہ اگر چچی جاگ گئیں تو سوسو باتیں کریں گی کہ اتنی رات کو نہ جانے کس سے باتیں ہو رہی تھیں.....؟

وہ تو یوں بھی اس میں نقص نکالتی رہتی تھیں۔ وہ تو چچا میاں کی وجہ سے یہاں رہ رہی تھی جو چاہتے تھے، وہ اپنا گریجویشن مکمل کرے، ورنہ طاہرہ چچی کو تو وہ ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ اس کے والد پچھلے سال ہی ریٹائرڈ ہوئے تو واپس اپنے آبائی شہر فیصل آباد چلے گئے اور ماورا کو چچا میاں کے ہاں اس لئے چھوڑا تھا کہ ابھی وہ تھرڈ ایئر میں تھی اور وہ خود بھی نہ چاہتی تھی کہ اس کا سال ضائع ہو جائے۔ بس اس لئے اسے چچا میاں کے ہاں آنا پڑا تھا ورنہ اس کا تو ہاسٹل میں رہنے کا پروگرام تھا مگر ابامیاں اور چچا میاں کا خیال تھا کہ شاید اکیلی وہ گھبرا جائے اس لئے وہ اسے اپنے گھر لے آئے تھے۔ تھرڈ ایئر کے ایگزام کے بعد وہ چھٹیاں فیصل آباد ہی میں گزار آئی تھی۔ بس چچی کو وہ پسند اس لئے نہ تھی کہ ان کے بیٹے کیپٹن راشد نے اسے اپنی پسند کہہ ڈالا تھا۔ اب بھلا اس میں ماورا کا کیا قصور تھا.....؟ مگر انہیں تو زرا قصور ہی اسی کا لگا تھا کہ بقول ان کے

”راشد تو بہت معصوم تھا، بہت نیک تھا۔“

یہ تو شکر ہوا کہ راشد کا ٹرانسفر کھاریاں ہو گیا تھا اور ماورا کی جان چھوٹی تھی، اور شاید اسی لئے کیپٹن راشد نے بھی یہ طے کر لیا تھا کہ جب تک ماورا ان کے ہاں ہے، وہ گھر نہیں جائے گا۔ اسے اپنی ماں کی ذہنیت پر بہت دکھ ہوا تھا مگر وہ کیا کرتا کہ وہ ماں کو کچھ نہ کہہ سکتا تھا،

مگر گھر نہ جانے کا استحقاق تو رکھتا تھا۔

اپنے قدموں میں زنجیر تو خود ہی ڈال سکتا تھا، سو وہ اپنے فیصلے پر قائم تھا۔ کبھی کبھار فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دے دیتا تھا۔ اور اب ماورا کا فائل ایئر تھا۔ وہ خود بھی ایگزام کے دن گن رہی تھی کہ ”شہریار“ کے نام کا پتھر اس کی پرسکون زندگی میں ہلچل مچا گیا تھا۔ کیونکہ اب تو اکثر ایسا ہونے لگا تھا۔ وہ رات کے وقت فون کرتا، کوئی اور انینڈ کرتا تو وہ بات کئے بنا سلسلہ منقطع کر دیتا اور حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ وہ ماورا کی آواز پہچان لیتا تھا اور کہتا۔

”آپ وہی ہیں ناں، فضول لوگوں سے بات نہ کرنے والی.....؟“

وہ تصدیق چاہتا اور ماورا بارہا کہہ چکی تھی۔

”میں وہ نہیں ہوں.....!“

مگر وہ مانگا ہی نہ تھا، بلکہ کہتا۔

”آپ کا لہجہ، آپ کی آواز کی کوہلتا میرے ذہن میں بیٹھ گئی ہے اور یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ میں آپ کو پہچان نہ پاؤں۔ آپ کی آواز تو میں ہزاروں بلکہ لاکھوں میں پہچان سکتا ہوں۔“

”اچھا.....!“

پتا نہیں اس کی باتوں میں ماورا کیوں دلچسپی لینے لگی تھی.....؟ آہستہ آہستہ اسے خود بھی محسوس ہونے لگا، جیسے وہ اس کے فون کی منتظر رہتی ہو اور اپنی اس کیفیت پر وہ حیران بھی تھی۔ اس کی کلاس فیلوز صائمہ اور پیلا کا خیال تھا۔

”بنالو بے وقوف اسے جو خود ایسا چاہے۔“

”نہیں ماورا.....! تم ایسی کوئی حرکت نہ کرنا جو کل کو تمہارے لئے عذاب ہو۔“

ان کے گروپ میں فرح سب سے زیادہ سمجھدار تھی۔

”لو.....! عذاب کی کیا بات ہے.....؟ اور کون سا ماورا اس کی محبت میں جتلا ہونے

جاری ہے.....؟“

صائمہ بولی۔

”محبت میں جتلا ہونے کے لئے کیا سوچنا پڑتا ہے.....؟“

فرح نے آہستہ سے کہا۔

”بالکل.....!“

صائمہ بولی۔

”پھر وہ محبت تو نہ ہوئی۔“

فرح بولی۔

”پھر کیا ہوا.....؟“

بیلا نے پوچھا۔

”سودے بازی.....! محبت اور سودے بازی میں بہت فرق ہے۔“

”چلو اگر ماورا کو اس سے محبت ہوگئی تو کیا ہوگا.....؟“

صائمہ نے شرارت سے کہا۔

”کیوں ہو مجھے محبت ایک انجانے سے بندے سے.....؟“

اس نے چیخ کر کہا۔

”یار.....! محبت کرنا کوئی مشکل کام ہے.....؟“

بیلا نے چھیڑا تو فرح مسکرا دی اور بولی۔

”محبت کرنا بے حد آسان کام ہے، مگر محبت کا دکھ برداشت کرنا بے حد مشکل.....!“

محبت صرف چند روز ہوتی ہے، مگر اس کا ہجر برسوں پر محیط ہوتا ہے۔“

”بڑا تجربہ ہے.....!“

بیلا نے آنکھیں نہچائیں۔

”ہاں.....! تجربہ ہے۔“

فرح نے ٹھنڈی سانس لی۔

”پھر ہمیں کیوں نہ بتایا.....؟“

وہ تینوں ایک ساتھ چھینیں۔

”اپنے دکھوں کی تشہیر کون کرتا ہے بھلا.....؟“

فرح دکھ سے مسکرائی۔

”محبت دکھ تو نہیں.....!“

بیلا بولی۔

”محبت دکھ بھی ہے۔“

فرح نے لفظ ”بھی“ پر زور دیا۔

”کہتے ہیں، محبت ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔“

”محبت خوشبوؤں کے لئے، محبت موسموں کا دھن، محبت دل، محبت جاں، محبت روح

کا درماں ہوتی ہے۔“

”یہ سب شاعروں کی باتیں ہیں۔“

فرح ہولے سے بولی۔

”اصل میں تو محبت کرب کا آبلہ ہے، جب یہ پھوٹ جائے تو محبت روگ ہوتی

ہے، محبت سوگ ہوتی ہے۔“

”ہر ایک کے اپنے تجربے ہیں، اور ماورا اپنا تجربہ کرے، یقیناً اس کا تجربہ مختلف

ہوگا۔“

بیلا نے کہا۔

”تم کیوں میرے پیچھے پڑی ہو.....؟ میں اسے تمہارا فون نمبر دے دوں گی، وہ تم

سے بات کرے تو کر لینا محبت.....!“

ماورا نے غصے سے سلگ کر کہا۔

”یار.....! وہ کبھی نہیں مانے گا۔ تم اسے اچھی لگی ہو، میں تو نہیں.....!“

”نہ دیکھنا نہ بھالا، اور اچھی لگ گی.....؟“

ماورا نے سر جھٹکا۔

”مجھ سے لکھوالو، ایک روز وہ تم سے اظہار محبت کر ڈالے گا۔“

صائمہ وثوق سے بولی۔

”پاگل ہوا ہے ناں.....؟“

ماورا نے ہنس کر کہا۔

”تمہارا کیا جاتا ہے.....؟ بنا لو پاگل.....!“

”ہاں.....! کل ملنے کی فرمائش کر ڈالے پھر.....؟“

ماورا نے کہا۔

”پھر تم انکار کر دینا یا مل لینا.....! حرج ہی کیا ہے بھی.....؟ شادی تو کرنی ہے تم نے، اگر اچھا لگے تو ٹھیک، ورنہ جھنڈی دکھا دینا۔ اللہ اللہ خیر صلا.....!“

صائمہ بے پرواہی سے بولی۔

”یہ باتیں ہمارے معاشرے میں زیب نہیں دیتیں۔“

ماورا نے کہا۔

”ڈرتی رہنا ڈنیا سے.....!“

پیلانے کہا۔

”میری چچی جو ہیں ناں.....“

”بلا ہیں، کھا جائیں گی۔“

پیلانے سے میں تھی۔

”بلا سے کم بھی نہیں ہیں۔“

ماورا مسکرا دی۔ پیلانے کی باتیں ہی اس قدر بے ساختہ ہوتی تھیں اور پھر ماورا نے شرارت میں شہریار سے دوستی کر لی اور اس کے بہت مجبور کرنے پر اپنا نام پیلانے دیا۔

”صحیح نام بتایا ہے ناں.....؟“

اسے شک تھا۔

”شک کی وجہ.....؟“

”ویسے ہی پوچھا تھا۔ اب ہماری دوستی کچی.....!“

وہ خوش ہوتا ہوا بولا۔

”بالکل.....! اب یہ نہ ہو کہ نام پتا چل گیا ہے تو گھر میں کہیں کہ پیلانے کو بلا دیں۔“

”ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ آپ کی عزت میری عزت ہے پیلانے.....! اور کوئی شخص نہیں

چاہتا کہ اس کی عزت پر حرف آئے۔“

”صمیمتس.....!“

اس نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

آہستہ آہستہ دونوں ہی بے تکلف ہونے لگے تھے۔ شہریار نے اسے بتایا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اور ہاسٹل میں رہتا ہے۔ ویسے اس کا تعلق ہیر کے شہر جھنگ سے ہے۔

جبکہ ماورا اسے یہ نہ بتا سکی کہ وہ چچا کے ہاں رہتی ہے بلکہ وہ تو اسے گھر بھر کے قصے سناتی، جس طرح کوئی والدین کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ اسے بتاتی۔

”میں بہت منہ پھٹ ہوں شیریں.....! پتا ہے، میری اماں مجھ سے بہت تنگ رہتی ہیں۔“

”کیوں.....؟“

وہ ڈلا رے پوچھتا۔

”میں بولتی بہت ہوں ناں.....!“

”مجھے تو تمہارا بولنا بہت اچھا لگتا ہے۔“

”یہ تم ہو، میں اپنی ماں کی بات کر رہی ہوں۔“

وہ سنجیدگی سے کہتی اور شہریار ہنس دیتا۔ اس کی ہنسی ماورا کے دل میں جلتی رنگ بجا دیتی تھی، اور آخرا ایک روز باتوں کے دوران شہریار نے کہا تھا۔

”آئی لو پو پیلانے.....!“

”جی.....؟“

اسے اُمید نہ تھی اس بات کی۔

”بھئی.....! مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔“

”اچھا.....!“

وہ ہنسی۔

”اس میں ہسنے کی کیا بات ہے بھلا.....؟ میں کب سے یہ جملہ کہنے کے لئے خود کو

تیار کر رہا تھا۔“

شہریار نے بتایا۔

”بہت مشکل جملہ تھا۔“

اس نے پوچھا۔

”جملہ تو مشکل نہ تھا، البتہ اس کی ادائیگی مشکل تھی۔ اکثر حلق میں ہی اٹک جاتا

تھا۔“

اس نے بتایا۔

”حیرت ہے.....! یہ کہنا کون سا مشکل ہے.....؟“

”آپ کہہ دیں.....!“

”کہہ سکتی ہوں۔“

وہ بولی۔

”نہیں کہہ سکتیں۔“

”چیلنج نہ کریں۔“

”کردیا چیلنج.....! آپ نہیں کہہ سکتیں۔“

شہر یار نے کہا۔ اور پتا نہیں، اس وقت ماورا کی عقل کہاں چلی گئی تھی.....؟ فوراً ہی

بولی۔

”آئی لو یو شیر.....“

ایک دم ہی اس کے لب بھینچ گئے تھے۔ جلدی سے اس نے ریسیور رکھ دیا۔ دل پسلیوں کے درمیان زخمی کبوتر بنا ہوا تھا۔

”یہ کیا کر دیا.....؟“

”یہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔“

اسے خود سے ہی شرم آ رہی تھی، مگر جس طرح کمان سے نکلا تیر واپس نہیں آتا، اسی طرح زبان سے نکلے جملے بھی واپس نہیں آتے۔ مگر اب تو کچھ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اسے احساس تھا کہ جو کچھ اس نے کہا ہے، وہ سچ ہے اور جو شہر یار نے کہا تھا، یہ تو وہ خود بھی سننا چاہتی تھی۔ اور محبت کا یہ دھیمادھیمہ احساس اسے ایک نئی دنیا میں لے گیا تھا۔ اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تو لگا، وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہو گئی ہو۔

اب شیشہ دیکھنا اسے اچھا لگتا تھا۔ شہر یار کے بارے میں سوچنا بھی بہت اچھا لگتا اور محبت کا یہ نیا نیا سا احساس اسے کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیتا تھا۔ شہر یار کہتا۔

”بھئی مجھ سے ملو بیلا.....!“

”آپ یہ نہ کہا کریں۔“

”کیوں.....؟“

وہ پوچھتا۔

”مجھے خوف آتا ہے۔“

”یار.....! کبھی بازار وغیرہ جاؤ تو مجھے ہٹاؤ۔ میں پہنچ جاؤں گا۔ صرف تمہیں دیکھنا

چاہتا ہوں۔ میں بات نہیں کروں گا تم سے، یہ وعدہ.....!“

”اگر میں تمہارے خیال کے مطابق نہ ہوئی تو.....؟“

”تم کیسی بھی ہو، بس طے ہے کہ میری زندگی کی ہم سفر تم ہی ہوگی۔“

وہ دثوق سے کہتا۔

”میں کالی کلوٹی سی اور بھنگی ہوں، موٹی سی اور..... اور.....“

اس کی بات پر شہر یار زور سے ہنس دیا۔

”ہنسے کیوں.....؟“

”اس لئے کہ تم ایسی نہیں ہو۔“

”میں ایسی ہی ہوں.....!“

وہ اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے بولی۔

”اچھا.....! تم مجھے اپنی تصویر بھیج دو۔“

”پہلے آپ بھیج دیں۔“

”مجھے تو دیکھ کر تم نے چیخ ماری ہے اور بے ہوش ہو جانا ہے۔“

”نہیں ہوتی.....!“

وہ ہنسی۔

”چلو مل لو.....!“

”ملوں گی نہیں.....!“

اس نے صاف انکار کر دیا۔

”کیوں.....؟“

”بس.....! ویسے ہی.....!“

”اچھا.....! سمجھ گیا.....!“

”کیا سمجھے.....؟“

”تم ایک ہی مرتبہ جملہ عروسی میں ملنا چاہتی ہو۔“

وہ شرارت سے بولا۔

”بدتمیز.....!“

اسے بے تحاشا شرم آگئی تھی۔

”اب شرماؤ تو موت.....!“

”میں شرماؤ نہیں رہی۔“

وہ چھپنی چھپنی ہنسی ہنس دی۔ شہر یار سے بات کر کے وہ فریش ہو جاتی تھی۔ بیلا اور

صائمہ کہتی تھیں۔

”مل لو ناں.....!“

مگر ماورا نے سختی سے اپنے آپ پر پھرے بٹھائے ہوئے تھے۔ یوں بھی فرح کہتی

تھی۔

”ماور.....! اگر ایک بار تمہاری جھجک کھل گئی تو پھر تم دلدل میں اتر جاؤ گی۔ بس یہی

فون والا سلسلہ صحیح ہے اور یوں بھی بہت زیادہ خواہشیں بہت دکھ دیتی ہیں۔ اس عمر کی خواہشیں

یادوں کا ناسور بن جاتی ہیں جو ہمیشہ رستا ہی رہتا ہے، زخم تازہ کی صورت۔“

فرح کی باتیں اس کے لئے مشکل راہ تھیں، تبھی تو اس نے شہر یار کو اپنے بارے میں

کچھ بھی سچ نہ بتایا تھا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ گزشتہ سال گریجویشن کیا ہے اور وہ کہتا۔

”تم یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لو.....!“

”مجھے اجازت نہیں ملتی۔“

”کیوں بھی.....؟“

”بس.....! اباجی نہیں مانتے کہ میں آگے پڑھوں۔“

”اس کی کوئی وجہ تو ہوگی.....؟“

”بھئی.....! مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ پڑھی لکھی لڑکیوں کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں

اور پھر والدین کی پسند سے وہ رشتے نہیں کرتیں اور کر بھی لیں تو نباہ روکھا ہوتا ہے۔“

”زیادہ پڑھ کر تو آگئی کے درواہ ہوتے ہیں۔“

وہ کہتا۔

”ہم جیسوں کے ساتھ الٹا معاملہ ہوتا ہے۔“

”تم بور نہیں ہو تمس قالتو بیٹھ کر.....؟“

”اوں ہوں.....!“

ماورا کہتی۔

”بھئی.....! کمال ہے۔“

”کمال ہو یا ندیم، گھر میں بیٹھ کر بوریت کا کیا سوال.....؟“

”چلو مجھ سے ملو تو.....!“

وہ پھر اپنی خواہش لیوں پر لے آتا۔

”بھئی شیری.....! مسئلہ ہے۔“

”کیا.....؟ بتاؤ مجھے۔“

وہ جاننا چاہتا تھا۔

”تم مجھے اچھے لگتے ہو۔“

”واقعی.....؟“

وہ خوش ہو گیا۔

”بات تو پوری سنو.....!“

وہ مصنوعی غصے سے بولی۔

”اچھا پھر.....؟“

”پھر میرا دل چاہے گا، تمہیں چھو کر دیکھوں جو چیز اچھی لگتی ہے، اسے چھونے کو تو جی

چاہتا ہے۔“

”تو چھو لینا مجھے، قسم سے کچھ نہیں کہوں گا۔“

اس نے اجازت دے دی۔

”پھر تم بھی تو جوابا ایسا ہی کرو گے.....؟“

”ہاں.....! یہ تو ہے۔“

”بس.....! اسی ڈر سے میں تمہیں نہیں ملتی۔“

”یہ تو زیادتی ہے ناں کہ تم مجھے دیکھو اور میں آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہوں۔“

”میں تو یہی چاہتی ہوں۔“

ماورا بولی۔

”تمہارا دماغ خراب ہے۔“

اور جب ایک روز ماورانے اسے کہا کہ وہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہ رہی ہے تو وہ

بے حد خوش ہوا۔

”مجھے اپنے ڈاکومنٹس بھیج دو، میں کروادوں گا ایڈمیشن۔“

”اماں راضی نہیں ہو رہی ہیں۔“

اس کی خوشی پر ماورا نے اس ڈال دی۔

”مناؤ یار.....! بھوک ہڑتال کر دو۔“

وہ بے تابی سے بولا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

ماورا انہی ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”بھوکی نہیں رہ سکتیں دو چار ٹائم.....؟“

وہ ڈانٹ رہا تھا۔

”بھئی.....! میں تو آج اماں سے بھی لڑ بھی پڑی۔“

ماورا نے کہا۔

”کیا کہا.....؟“

وہ جاننا چاہتا تھا۔

”میں نے کہہ دیا کہ مجھے یونیورسٹی میں ایڈمیشن دلواؤ ورنہ میری شادی کر دو۔“

”پارے.....! تم نے کہہ دیا.....؟“

وہ حیرت زدہ تھا۔

”ہاں.....!“

ماورا نے سر ہلایا۔

”پھر اماں کچھ نہیں بولیں.....؟“

”اپنے سیلپر کا ہوائی فائر کیا تھا مگر نشانے پر نہیں بیٹھا۔“

وہ شوخی سے بولی۔

”بڑی بات ہے.....!“

”دیکھ لو.....! میں کس قدر منہ پھٹ ہوں۔“

”منہ پھٹ نہیں.....! بے وقوف ہو۔“

”کیسے بھلا.....؟“

”ایسی باتیں بھلا ماں سے کی جاتی ہیں۔“

”میں تم سے کر لیتی ہوں تو ان سے بھی کر سکتی ہوں۔“

”میں تمہاری اماں تو نہیں.....!“

”بھئی.....! اماں بھی مجھ سے محبت کرتی ہیں اور تم بھی محبت کے دعویدار ہو اور جو مجھ

سے محبت کرے گا، اسے ہر بات برداشت کرنی پڑے گی۔“

اس نے لہک لہک کر کہا اور وہ اس کی باتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔

ماورا اس سے ایسی ایسی باتیں کرتی تھی کہ اسے خود بھی حیرت ہوتی۔ کبھی بھی وہ اتنا

نہ بولتی تھی اور شہر یار نے اسے بولنا سکھا دیا تھا۔ بیلا اور صائمہ اسے روز نئے واقعات بتاتیں،

اسے کہتیں۔

”مل لو ناں یار.....!“

مگر ملنے سے تو وہ خوفزدہ تھی۔ کسی کے دیکھے جانے کا ڈر لگا رہتا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے

دل میں اُگے محبت کے ننھے سے پودے کو درخت میں بدلنے سے نہ روک سکتی تھی۔ اب تو چچی کی

کیلی باتیں بھی اسے بری نہ لگتی تھیں۔ ریحانہ اور شبانہ کے ساتھ کیرم بھی نہ کھیلتی۔

اور جو کبھی کبھی وہ رافع کے ساتھ کرکٹ کھیل لیتی تھی، وہ بھی اب ختم ہی ہو گیا تھا۔

حالانکہ رافع کتنی مرتبہ کہتا۔

”ماورا ماجی.....! میرے ساتھ کھیلیں ناں.....؟“

اور وہ پڑھائی کا بہانہ بنا لیتی تھی۔

”مجھے پڑھنے دو رافع.....! کہ آخر میں نے اپنے گھر جانا ہے، پاس نہ ہوئی تو پھر

یہاں رہنا پڑے گا۔“

”اور تم یہاں نہیں رہنا چاہتیں۔“

شبانہ بولی تھی۔

”شاید ہاں.....!“

نہایت سچائی سے اس نے کہہ ڈالا تھا۔

”بڑی مطلب پرست ہو.....!“

شبانہ نے اسے دھب لگائی تھی۔

کبھی کبھی شبانہ کو شک گزرتا تھا تو وہ کہتی۔

”یار ماورا.....! آخر تم اتنی دیکس سے بات کرتی ہو.....؟“

”بتایا ہے ناں، صائمہ ہوتی ہے یا بیلا۔“

”کالج میں باتیں ختم نہیں ہوتیں۔“

”وہاں کلاسز لیتے ہیں اور پھر نوٹس کی ڈسکشن ہم رات کو کرتے ہیں اور ہم نے کیا

باتیں کرنی ہوتی ہیں اور پھر دیکھو، وہ خود فون کرتی ہیں، میں نے تو کبھی نہیں کیا۔“

”یہ مطلب نہیں ہے، تم خود بھی فون کر لیا کرو۔“

”یعنی تمہیں شک ہے.....؟“

”یار.....! یہ بات نہیں، ویسے کوئی اچھا لگ جائے تو حرج ہی کیا ہے، ہم تو دوست

ہیں بتا دینا۔“

شبانہ نے شرارت سے کہا۔

”نی الحال ایسا کوئی معاملہ نہیں۔“

نہایت دھڑلے سے اس نے جھوٹ بول دیا تھا۔ یوں بھی شہر یار کے ساتھ جھوٹ

بول بول کر خاصی پکی ہو گئی تھی۔ اب اسے جھوٹ بولنا مشکل نہ لگتا تھا۔

شہر یار آج کل اس سے خفا تھا اور خفگی کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس سے ملتی نہ تھی۔ اب جبکہ

تین روز سے ساون کی پہلی بارش ہوئی تھی تو شہر یار نے اسے فون نہ کیا تھا۔ حالانکہ کتنی مرتبہ اس

کا جی چاہا، وہ شہر یار کو فون کر کے کہے۔

”ایسے موسم میں روٹھنا اچھا نہیں.....!“

باد جو دھم کے بھی وہ اس کے ہاسٹل فون نہ کر سکی کہ ہمیشہ وہ خون ہی فون کرتا تھا۔

ماورا کے پاس نمبر تھا بلکہ اس نے خود ماورا کو اپنے ہاسٹل کا فون نمبر مع کمرہ نمبر کے دیا تھا مگر ماورا

نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ روز رات کو وہ مخصوص وقت پر فون کر ڈالتا تھا، پھر کیا ضرورت

تھی خود لٹ ڈاؤن ہونے کی.....؟

مگر آج وہ بہت بے چین تھی۔ برستے سینہ میں وہ والاں سے ٹی وی لاؤنج تک

چکراتی پھر رہی تھی اور دھیان صرف شہر یار کی طرف تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس سے بہت خفا

ہے۔

”مگر میں تمہاری غلط بات نہیں مان سکتی۔“

وہ تصور ہی تصور میں اس سے مخاطب تھی۔

”ہوتے رہو ناراض.....!“

”چلو فرح سے کپ شپ کر لیتے ہیں۔“

اس نے سوچا۔ چچی تو اپنی بہن کے ہاں گئی ہوئی تھیں، شبانہ پکڑے بناری تھی، جبکہ

ریحانہ کپڑوں کا ڈھیر استری کرنے میں لگی تھی۔ وہ اندر آئی ہی تھی کہ

”ٹرن.....! ٹرن.....!“

دوسری تہل پر ہی اس نے ریسور اٹھالیا اور نہایت آہستگی سے بولی۔

”ہیلو.....! ہیلو.....!“

پھر ایک دم ہی اسے کوڑور ڈیا دیا گیا۔

”ہیلو جی.....!“

وہ جب تک ہیلو کے ساتھ ”جی“ نہ بولتی تھی شہر یار جواب نہ دیتا تھا۔

”السلام علیکم.....!“

بھاری ایک دم چھا جانے والی آواز اس کی سماعتوں میں ٹھنڈک بن کر اتر گئی اور نہ

جانے کیوں آنکھوں میں آنسو آ گئے.....؟

”کیا حال ہیں.....؟“

”آپ کو کیا.....؟“

وہ ٹکلف سے بولی۔

”خفا ہو.....؟“

وہ منہ ربا تھا۔

”نہیں تو“

وہ منہ بنا کر بولی۔

”بھئی.....! خفا تو مجھ کو ہونا چاہئے۔“

شہر یار نے کہا۔

”وجہ.....؟“

اس نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

”تم ملتی جو نہیں ہو۔“

”میں بھی خفا ہوں۔“

ماورا نے کہا۔

”اچھا.....! وجہ بتاؤ.....!“

”پتا نہیں.....! ساون برس رہا ہے اور.....“

”ہوں.....! اور تمہارا دل بھی مجھ سے بات کرنے کو چاہ رہا ہے۔ ہے ناں.....؟“

وہ نہایت یقین سے کہہ رہا تھا۔

”ہاں.....! چاہ رہا تھا، پھر.....؟“

”فون کر دیتیں۔“

وہ بولا۔

”کیا کہتی.....؟“

”ساون کے دن آئے بالم.....!“

وہ لہک کر بولا تو ماورا ہنس دی۔

”جھٹکنکس گاؤ.....! یہی ہنسی سننے کے لئے تو میں نے اپنا اصول توڑ ڈالا ہے۔“

”کیا اصول.....؟“

ماورا نے پوچھا۔

”یہی کہ تم نہیں ملیں تو میں بھی نہیں ملتا۔ مگر اس موسم نے توجہ بوں میں آگ لگا دی

ہے اور پیلا جانی، ایسا موسم اُداس کیوں کر دیتا ہے.....؟“

”مجھے کیا پتا.....؟“

”ہاں.....! تمہیں تو کچھ پتا ہی نہیں.....!“

وہ سگ کر بولا۔

”تم بتا دو ناں.....!“

”یہ موسم خواہشوں کا موسم ہوتا ہے اور میرے دل کے سمندر میں بھی کل سے ایک

خواہش بار بار ابھرتی ہے۔“

”کیسی خواہش.....؟“

”بتا دوں.....؟“

”ہوں.....!“

اس نے ہنکارا بھرا۔

”تم شرم جاؤ گی۔“

”میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔“

اس نے کہا تو شہر یار زور سے ہنس دیا۔ کبھی کبھار وہ ایسے اونچے اور زندگی سے

بھرپور قہقہے لگاتا تھا اور ماورا کو بہت ہی اچھا لگتا۔

”ہاں.....! بتاؤ ناں.....! کیسی خواہش.....؟“

وہ جانتا چاہتی تھی۔

”بھئی.....! سیدھی سی بات ہے، انسان جسے دل کی تمام تر شدتوں سے چاہتا ہے،

ایسے موسم میں اس کے قرب کے لئے دل چلتا ہے اور میرا جی بھی چاہتا ہے، آپ میرے ساتھ

ہوں، سمندر کا ساحل ہو، ہم دونوں ٹھنڈی ریت پر ٹہلیں، آپ کا ہاتھ میں نے تھاما ہو اور.....

اور.....“

”پھر آنکھ کھل جائے.....!“

ماورا جلدی سے بولی۔

”سارے موڈ کا ستیاناس کر دیا ہے۔“

شہر یار جھنجھلا گیا۔

”شیری.....! ہم کبھی ضرور ملیں گے۔“

ماورا اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔

”کب یار.....؟ جب میں مرجاؤں گا تب.....؟“

”خدا نہ کرے.....!“

اس نے کہا۔

”ہاں.....! میں بوڑھا ہو جاؤں، تب ملنا مجھے۔“

وہ منہ بسور کر بولا، اور وہ اسے سمجھاتی رہی۔

”دیکھو ناں، ڈر لگتا ہے کوئی دیکھ لے تو.....؟“

”یار.....! کوئی نہیں دیکھے گا، میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”ہاں.....! ہم سلیمانی ٹوپی پہن لیں گے ناں.....!“

”تم چلو تو سہی.....!“

”میں رسک نہیں لے سکتی۔“

”پھر یوں کرو، اپنے گھر کا پتا بتادو، میں وہیں آ جاتا ہوں۔“

”کیوں.....؟“

ماورا نے پوچھا۔

”تمہیں دیکھ لوں گا۔“

”مجھے پتا ہے، تم مجھے دیکھ کر رجحکٹ کر دو گے۔ کہو گے، پرے پرے.....!“

”یار.....!“

واضح طور پر لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے بال نوچ رہا ہو۔

”تم مجھے کھو دو گی.....؟“

”کھو نا تو ہے.....!“

”مگر میں نے تمہیں پانا ہے۔“

”کیسے.....؟“

وہ جانا چاہتی تھی۔

”اچھا.....! میں فون پر تم سے نکاح پڑھوا لیتا ہوں، پھر تو ملو گی.....؟“

”پھر دیکھنے کے بعد طلاق دے دو گے تو میں کیا کر لوں گی.....؟“

”اچھا بھئی.....! دفع ہو جاؤ، مرو پرے.....!“

وہ ہار سا گیا تھا اور ماورا ہنس ہنس کر ڈہری ہوئی جا رہی تھی۔

”ہنس لو بیلا جانی.....!“

اسی دنیا میں تجھے پانا ہے

آؤں گا عمر دوبارہ لے کر

شہر یار نے اپنے جذبات کو شعر میں بیان کیا۔

”واقعی دوبارہ آؤ گے.....؟“

”ضرور.....!“

وہ بولا۔

”پھر تو میں بوڑھی ہوں گی۔“

”تم مجھے ہر صورت میں قبول ہو۔ تم مجھے کس قدر عزیز ہو، میں بیان ہی نہیں کر

سکتا۔“

”مت بیان کرو کہ باہر مارن بج رہا ہے، شاید گھر والے آگئے ہیں۔ اوکے.....!“

”اللہ حافظ.....! آئی لو بیلا.....!“

”آئی تو یوشیری.....!“

ماورا نے کہا اور ریسور کریڈل پر رکھ کر جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے پتا

تھا کہ چچی آگئی تھیں۔



ممکن نہیں تھا جو وہ ارادہ نہیں کیا

ہم نے اسے بھلانے کا وعدہ نہیں کیا

لجے میں اس کے رنگ تھا کم اعتماد کا

ہم نے بھی اعتبار زیادہ نہیں کیا

دن اپنی پوری خوب صورتی کے ساتھ گزر رہے تھے کہ ایک دم ہی کیپٹن راشد علی کے

سہرے کے پھول کھل اُٹھے اور صرف پندرہ روز کے اندر اندر ہی تانیہ بیگم سے ان کی شادی کی

بات پکی ہو گئی۔ شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ شہر یار چند روز کے لئے اپنے

گھر گیا ہوا تھا۔ انہی دنوں میں ماورا کے ایگزٹام بھی تھے اور گھر میں شادی کا ہنگامہ بھی۔ اس

نے کئی بار سوچا تھا کہ چچی کو ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ میرے فائل ایگزام ہیں۔
وہ کبھی بھی احساس نہ کرتی تھیں۔ اس لئے ماورا چھت پر پڑھنے چلی جاتی تھی۔ اس
روز اس کا آخری پرچا تھا، جس روز راشد علی کی رسم مایوں تھی اور اسی روز ماورا کے والد احمد علی اور
والدہ، چھوٹی بھابی اور بھیا شادی میں شرکت کے لئے آگئے تھے۔ والدین کو سامنے پا کر وہ
ساری تھکن بھول گئی تھی اور اکیلے میں شہلا بھابی نے پوچھا تھا۔
”میری نند کون سی کریم لگا رہی ہے آج کل.....؟“

”کیا مطلب.....؟“

اس نے حیرت سے کہا۔

”بھئی! خوب صورت ہو گئی ہو۔“

شہلا بھابی بولیں۔ وہ اس نے بہت بے تکلف تھیں۔

”کوئی بھی نہیں.....!“

وہ بے طرح شرما گئی۔

”سچ.....! شہباز تمہیں ایک نظر دیکھ لے تو پاگل ہو جائے۔“

”کون شہباز.....؟“

ماورا کے لئے یہ نیا نام تھا۔

”تمہارا مگیت.....!“

”میرا مگیت.....؟“

مارے حیرت کے اس کی آواز گھٹ گئی۔

”جناب.....! تمہارے سسرال والے آئے تھے۔ ابا جی کے بچپن کے دوست

ہیں، انکل قادر۔ جب تم پیدا ہوئی تھیں تو انہوں نے اپنے بیٹے شابی کے لئے تمہیں مانگ لیا

تھا۔ اب وہ کہہ رہے تھے، شابی کی تعلیم مکمل ہو گئی ہے اور.....“

”نہیں.....! نہیں بھائی.....! میں.....“

مارے دکھ کے اس کی آواز ہی نہ نکل رہی تھی۔

”ماورا.....!“

شہلا بھابی حیران تھی۔

”پلیز بھابی.....! اماں سے کہہ دیں کہ میں مری جاؤں گی۔ میں کسی شابی واپی سے
شادی نہیں کروں گی۔“

”مگر کیوں.....؟“

وہ جانتا چاہتی تھیں۔

”بس.....! میں ایسے رشتوں کو نہیں مانتی جو بچپن میں طے کر دیئے جائیں۔ بنا

دیکھے بھالے۔“

اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کس طرح انکار کرے.....؟

”پھر جسے تم نے دیکھا بھالا ہے، وہ کیسا ہے.....؟“

”جی.....؟“

اب حیران ہونے کی باری ماورا کی تھی۔

”ہاں ماورا.....! ڈیڑھ سال پہلے تک تو تمہارے اس طرح کے نہ خیالات تھے اور

نہ ہی تم اس قدر بولتی تھیں۔ تم تو ہر بات میں ”ہاں جی“ کرنے والی لڑکی تھیں۔ کون ہے وہ جس

کی محبت نے تمہیں اتنی بولڈ نہیں دے دی ہے.....؟“

شہلا بھابی نے نہایت کھوجتی ہوئی نظروں سے لہے دیکھا۔ ایک لمحے کو تو وہ

ششدر رہ گئی اور آخر اس نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا۔

”آپ میری مدد کریں گی ناں.....؟“

”ہاں، کروں گی۔ بشرطیکہ وہ بھی مخلص ہو۔“

وہ بولیں۔

”وہ مخلص ہے بھابی.....!“

ماورا نے کہا۔

”ماورا.....! تو بہت معصوم ہے اور زمانہ بہت چالاک۔“

”آپ اس سے بات تو کریں ناں.....!“

”تم خود بات کرو، اسے کہو اپنے والدین کو بھیجے۔“

انہوں نے کہا۔

”ٹھیک ہے.....! میں کہہ دوں گی مگر.....“

ماورا کچھ سوچتے ہوئے بولی۔
 ”اگر مگر کچھ نہیں.....! آگے میں سنبھال لوں گی۔“

شہلا بھابی نے حوصلہ دیا۔

”سوئٹ بھابی.....!“

وہ شہلا کے گلے لگ گئی۔ ایک دم ہی دکھ کے سامنے بادل جو چھٹ گئے تھے اور وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

شام کو سب ہی رسم مایوں کے لئے تانیہ کے گھر چلے گئے مگر ماورا نہ گئی کہ وہ ہر صورت میں شہر یار سے بات کرنا چاہتی تھی۔ شبانہ اور ریحانہ نے بہت کہا حتیٰ کہ چچی نے بھی کہا تھا کہ وہ ساتھ چلے، مگر اس نے صاف انکار کر ڈالا۔

سب کے جاتے ہی اس نے ہاسٹل کا نمبر ڈائل کیا۔ اتنے عرصے میں پہلی بار اس نے شہر یار کا دیا ہوا نمبر ملایا تھا۔ دوسری جانب سے ریسپور اٹھایا گیا تو اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے، پھر بھی اپنی ساری ہمتیں مجتمع کر کے وہ بولی تھی۔

”جی..... وہ روم نمبر 34 سے شہر یار کو بلا دیں۔“

”راجا شہر یار.....؟“

”راجا..... جی..... جی ہاں.....!“

ایک دم ہی اس نے کہا۔

”وہ تو جی ابھی تھوڑی دیر قبل ہی باہر گئے ہیں، آپ اپنا نام بتا دیں، میں انہیں بتا

دوں گا۔“

”کب تک آئیں گے.....؟“

”یہ پتا نہیں.....!“

”آپ ان کے روم میٹ سے پوچھ لیں اور سچ دے دیجئے گا کہ مجھے فون کر لیں۔“

ماورا نے کہا۔

”اچھا جی.....!“

ایڈیٹرنٹ نے کہا اور ماورا نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

”تم تو آگئے ہو اور مجھ سے بات ہی نہیں کی۔“

وہ رہ کر دکھ کی لہریں اس کے اندر سے اٹھ رہی تھیں اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح شہر یار سے رابطہ قائم کرے.....؟

رات گئے سب آگئے تھے مگر شہر یار کا فون نہ آیا تھا۔ کئی بار تو وہ روپکی تھی۔ صبح وہ نماز پڑھ کر باہر لان میں جا رہی تھی۔ سب لوگ تھک کر سوئے ہوئے تھے کہ فون کی کھنٹی بجی۔ اس نے جھپٹ کر ریسپور اٹھایا تھا۔

”ہیلو.....! ہیلو جی.....!“

”صبح بخیر.....!“

”تھینکس گاڈ.....! یہ تم ہو شیریں.....؟ کہاں غائب تھے.....؟“

”یہیں تھا۔“

وہ بولا۔

”تم گھر سے آگئے اور مجھے فون ہی نہیں کیا.....؟“

”رات تو آیا ہوں۔“

”غلط بات نہ کرو، میں نے فون کیا تھا۔“

”کب.....؟“

وہ حیران تھا۔

”کل سات بجے، تمہیں نہیں بتایا۔“

”کیوں.....؟ کیا تھا.....؟ اُداس ہو گئی تھیں.....؟“

وہ چپکا۔

”مذاق نہیں شیریں.....! میں بہت پریشان ہوں۔“

وہ رد ہانسی ہو گئی۔

”آخر ہوا کیا.....؟“

وہ پریشان ہو گیا۔

”پلیز شیریں.....! مجھے بچالو۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔

”ہیلا.....! سوئٹ ہارٹ.....! کیا ہوا.....؟“

”مجھے بچا لو شیریں.....! میں تم بن مر جاؤں گی۔ میں تمہاری محبت میں اتنی آگے جا چکی ہوں کہ پیچھے سارے راستے بند ہو گئے ہیں۔ پلیز شیریں.....! تم اپنے والدین کو ہمارے گھر بھیجیو ناں.....!“

”بیلا.....! تم کیا سمجھتی ہو، میں تم بن رہ سکتا ہوں.....؟“

وہ بولا۔

”پھر کب بھیجے گے.....؟“

اس نے آس بھرے لہجے میں پوچھا۔

”شاید کبھی نہیں.....!“

”کیا.....؟“

ماورا کو لگا جیسے چھت اس پر آرہی ہو۔

”میں گھر گیا تھا تو میں نے گھر والوں سے تمہارا ذکر کر ڈالا تھا۔ مگر میرے گھر والے

بہت روایت پرست ہیں، اور.....“

”یہ..... یہ تمہیں پہلے پتا نہیں تھا، جب اپنی ہم سفری کے خواب میری آنکھوں میں

سجائے تھے.....؟ جب اپنی محبت کے پودے کو روز اپنے جذبوں کا پانی دیتے تھے.....؟ اس

وقت کہاں تھے تمہارے روایت پرست گھر والے.....؟ اس وقت تم نے سب کچھ نہ سوچا.....؟

میری زندگی کے خوب صورت دس ماہ تم نے کھالے شہر یار.....!“

وہ پھٹ ہی تو پڑی۔

”میری بات تو سنو بیلا.....! میں تم سے ابھی شادی کرنے کو تیار ہوں۔ کر لو مجھ سے

کوڑھ.....“

”مت گالی دو مجھے۔ میں ایسے بندھن کی قائل نہیں ہوں جو بہت سارے رشتے توڑ

کر باندھا جائے۔ پلیز شہر یار.....! آئندہ مجھ سے بات نہ کرنا۔“

”بیلا.....! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں منالوں کا گھر والوں کو، مجھے وقت تو

دونوں.....!“

”جب منالو تو بات کرنا، ورنہ نہیں.....! میں بہت ہی اکل کھری لڑکی ہوں، نہ

جھوٹ کہتی ہوں اور نہ ہی جھوٹ برداشت ہوتا ہے۔ ہمارے عزیزوں میں کچھ شادیاں ہیں اور

ہم تین چار روز تک لاہور جا رہے ہیں۔ اگر تمہارے گھر والے مان جائیں تو اس نمبر پر فون کر کے میری دوست صائمہ سے کہنا کہ بیلا کو پیغام دے دیں اور اگر نہیں تو پھر فون کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، خدا حافظ.....!“

ماورا نے صائمہ کا فون نمبر دوسرے تہذیبیہ ہرا کر فون بند کر دیا۔ اسے شہر یار کے انداز سے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ شہر یار اس کے لئے فائنٹ کرے گا مگر اس نے تو بہت جلد ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

پھر شہر یار نے کئی بار فون کیا مگر ماورا نے انینڈ نہ کیا۔ کوئی بھی فون ریسیو کرتا، آگے سے جواب ہی نہ ملتا اور ماورا سمجھ جاتی کہ یہ شہر یار نے کیا تھا۔ دل ہمکتا۔ مگر بہت سخت پہرے اس نے خود پر بٹھالے تھے۔ شہلا بھابی نے مصروفیت کے باوجود بھی ایک دوبار پوچھا تھا۔

”بات ہوئی.....؟“

اور وہ کہہ دیتی۔

”نہیں.....! ابھی نہیں ہو سکی۔“

اور شہلا جس نے سائیکلو جی میں ایم اے کیا ہوا تھا، وہ صاف جان جاتی کہ ماورا جھوٹ بول رہی ہے، مگر کیا کرتی کہ وہ اسے شرمندہ نہیں کر سکتی تھی۔ ماورا نے صائمہ کو بھی بتا دیا تھا کہ اگر شہر یار اسے اس طرح پیغام دے تو وہ ضرور اسے بتا دے۔ یہ تو صائمہ کو علم تھا کہ ماورا، بیلا کے نام سے شہر یار سے دوستی کئے ہوئے ہے اور یہ تو جو کہ تھا جواب عذاب ہو گیا تھا۔ اب اسے لگتا، فرح ٹھیک کہتی تھی۔

راشد علی کے ویسے کے دوسرے روز وہ سب کے ساتھ فیصل آباد آگئی، اپنا سارا سامان سمیٹ کر۔ لیکن لگتا کہ دل وہیں کراچی میں رہ گیا ہو۔ اسے شہر کراچی یاد آتا تو شہر یار بھی بے حد یاد آتا۔ کتنی بار وہ صائمہ کو فون کر چکی تھی۔ شاید شہر یار نے کوئی اچھا حذرہ سنایا ہو مگر ہر بار مایوسی ہی ہوتی۔

اجنبی شہر یہ نسبت تو رہے گی تجھ سے

تیری گلیوں میں ہے کھویا ہوا اپنا کوئی

بار بار اس کے لبوں پہ یہ شعر چمکتا تھا اور وہ سوچتی۔

”شہر یار.....! اتنی شدت ہے تمہاری محبت میں، ابھی تو میں نے تم کو دیکھا نہ تھا،

تمہیں چھو بھی نہ تھا، تمہارے قرب اور لمس سے بھی نا آشنا ہوں، پھر یہ محبت کا احساس مجھے
 چین کیوں نہیں لینے دیتا.....؟ کیا محبت اتنا پاؤفل جذبہ ہے.....؟“
 وہ حیران ہوئی۔

اور پھر ایک روز اکل قادر کی فیملی آئی اور ماورا کے دائیں ہاتھ کی دوسری انگلی میں
 آنٹی قادر نے اسے خوب صورت سی انگٹھی پہنا ڈالی۔ وہ حیران حیران سی اپنا ہاتھ دیکھتی رہ گئی۔
 تنہائی میں شہلا بھابی کی گود میں سر رکھ کر بے تحاشہ رو دی۔

”ماورا.....! جانی.....! بہاؤ الو اس انجان شخص کی محبت کو اپنے آنسوؤں میں کہ وہ
 صرف لفظوں کا، جملوں کا کھلاڑی تھا۔ ایسے لوگ محبت کو کھیل سمجھ کر کرتے ہیں۔ اگر وہ مخلص ہوتا
 تو ضرور اپنے والدین کو بھیج دیتا۔ تم بھول جاؤ اسے، مجھے یقین ہے، تم شہباز احمد کے ساتھ بہت
 خوش رہو گی۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ سنجیدہ سا، سو برس سا، یہی تمہارے لائق ہے۔ وہ تو زندگی کے
 رستے پر چلنے والا ایسا مسافر تھا جس کی منزل اور تھی۔ تم بھول جاؤ اور اب صرف شبانی کے
 بارے میں سوچا کرو۔ سوٹ گرل.....!“
 شہلا بھابی اس کے آنسو پونچھتے ہوئے نہایت محبت سے بولے جا رہی تھیں اور آنسو
 تھے کہ اس کی آنکھوں سے بہے چلے جا رہے تھے۔

ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا
 ایک دن پچھڑ ہی جانا تھا

ابھی کچھ دن لگیں گے

دل ایسے شہر کے پامال ہو جانے کا منظر بھولنے میں

ابھی کچھ دن لگیں گے

جہان رنگ کے سارے خس و خاشاک

سب مرد و صنوبر بھولنے میں

ابھی کچھ دن لگیں گے

تھکے ہارے ہوئے خوابوں کے ساحل پر

کہیں اُمید کا چھوٹا سا اک گھر بنتے بنتے رہ گیا ہے
 وہ اک گھر بھولنے میں
 ابھی کچھ دن لگیں گے

اور یہ سچ تھا کہ شہر یا رکو بھولنے میں کچھ دن لگنے تھے مگر وہ بھولائے نہ بھولتا تھا۔ آخر
 ماورا بیاہ کر لاہور آگئی۔ شہباز احمد کے گھر کی دہلیز پار کرتے ہی اس پر ڈھیروں پھولوں کی چیتاں
 نچھاور کی گئیں۔ بے شمار رسمیں ادا ہوتی رہیں اور وہ گرم سم سی بیٹھی سارا تماشا دیکھتی رہی۔

اسے لگ رہا تھا جیسے وہ سب کے لئے تماشا ہے پھر اسے شہباز احمد کے کمرے میں
 پہنچا دیا گیا۔ اس کی شوخ سی کول سی نند سا حہ نے اس کا میک آپ دوبارہ کیا۔
 ”سچ بھابی.....! آپ کو بھیا دیکھیں گے تو غش کھا جائیں گے۔“
 اس کی بات پر ماورا مسکرا بھی نہ سکی۔

”بھیا بہت اچھے ہیں، آپ ان کا کہا مانیں گی تو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور جب
 آپ لوگ آئیں کریم کھانے جایا کرنا تو مجھے ضرور لے جانا۔ مجھے بھیا کے ساتھ جانے میں بہت
 مزہ آتا ہے۔ شور نہیں کرتے ناں، جو چیز کہو، فوراً لے دیتے ہیں جبکہ الطاف بھائی بہت کنجوس
 ہیں۔“

ساحرہ جلدی جلدی بولنے کے مرض میں مبتلا لگتی تھی اور ماورا کو یقین تھا کہ اس گھر
 میں فقط اسی سے اس کی دوستی ہوگی۔ عجیب طرح کا خوف اس کے رگ دپے میں اتر گیا تھا۔
 ”آپ چیخ کر لیں، تھک گئی ہوں گی، آرام کریں۔“

نہایت نرم سے لہجے میں شہباز احمد نے اسے کہا تھا اور وہ حیران تھی کہ انہوں نے نہ
 اس کا گھونگھٹ اُلٹا تھا، نہ اسے رونمائی دی تھی، بقول ساحرہ کے ”بھیا غش کھا جائیں گے“
 یہاں تو انہوں نے دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا تھا۔

”یقیناً ان کے ساتھ بھی ”زبردستی“ ہوئی ہے۔“

ماورا نے سوچا۔

”واہ مانک.....! تیرے کام نزلے ہیں۔ جنہیں دل میں بساتا ہے، ان کا ساتھ
 نہیں لکھتا اور جو ساتھ رہتے ہیں، وہ کبھی دلوں میں نہیں بس سکتے۔“

ماورا بیڈ سے اُتری تو پاؤں کی پازتیں بچ آئیں۔ وہ جلدی سے ڈرینگ روم میں

کھس گئی۔ سارے زیور اتار ڈالے تھے۔ پھولوں کے گہنے بھی اتار کر اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیئے اور کاشن کا سادہ سالباں پہن کر کمرے میں آئی تو شہباز احمد بیڈ پر دراز تھے۔ سفید شلوار سوٹ میں وہ خاصے کھڑے کھڑے لگ رہے تھے۔ وہ جبکہ کرکھڑی تھی۔

”بیٹھیں.....!“

انہوں نے اٹھ کر بیٹھے ہوئے اشارے سے اپنے قریب بیٹھنے کو کہا تھا اور وہ ایک کونے پر ٹنگ گئی۔

”ماورا.....! میں آپ کو بتاؤں کہ ہم دو مختلف راستوں کے مسافر تھے جنہیں بزرگوں نے ایک کر دیا ہے اور میری خواہش ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کے فیصلے کا احترام کریں، کبھی انہیں شکایت کا موقع نہ دیں۔ میں آپ سے مکمل طور پر کواپر ایٹ کروں گا، مگر پلینز.....! مجھ سے بہت سے توقعات نہ رکھئے گا کہ بہت زیادہ توقعات بہت دکھ دیتی ہیں۔“

وہ بولتے رہے اور ماورا سر جھکائے انگلیاں مروڑتی رہی اور وہ شہباز احمد کے لفظوں کے پیچھے پیچھے جذبوں کو اچھی طرح محسوس کر رہی تھی، کیونکہ شہباز وہ جملہ نہ کہہ رہا تھا جو اس کے دل میں تھا اور یوں بھی ماورا تو ایسی دلہن تھی جس کا ساجن اسے پہلی رات یہ کہہ دے۔

”میرا سب کچھ تیرا ہے، سوائے دل کے۔“

شہباز احمد نے یہ کہا نہیں تھا مگر وہ تو سمجھ گئی تھی۔

”اور ہاں.....! امی نے یہ ننگن دیئے تھے، آپ کی رونمائی کے۔“

انہوں نے دو ننگن اس کی طرف بڑھائے۔ دل تو اس کا چاہا، کہہ دے۔

”جب آپ نے میرا دلہن کا روپ دیکھا ہی نہیں تو یہ فارمیٹیشن پوری کرنے کی

ضرورت ہی کیا ہے.....؟“

جملہ حلق میں گھوٹ کر اس نے ننگن لے لئے اور شہباز احمد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اس نے پلکیں اٹھا کر دیکھا تو وہ مسکرا رہے تھے اور جواباً وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

ولیمہ اور چوٹی چالے کی رسموں کے بعد زندگی اپنے معمول پر آگئی تھی۔ ماورا نے

گھر داری پر توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ ساس، سر کو وہ بہت پیاری تھی۔ ساس کو وہ سب کی

طرح امی جی جی تھی اور سر کو ابوجی۔ یوں بھی جن عورتوں کو پتا ہو کہ وہ اپنے شوہر کے دل میں نہیں

اُتر سکیں تو وہ سرالیوں کے دل جیتنے کی کوشش کرتی ہے۔

فائزہ آیا (مند) کے شوہر تابش علوی نے شہباز سے کہا تھا کہ چھٹیاں ہیں تو وہ لوگ ہنی مون کے لئے ہنزہ، سوات چلے جائیں مگر شہباز احمد نہ مانے تھے اور وہ خود بھی نہ جانا چاہتی تھی کہ وہ شخص جس کے ساتھ وہ رات کے چند گھنٹے خوفزدہ ہو کر گزارتی تھی، بھلا ہر وقت اس کی نظروں کی رینگ میں کیسے رہ سکتی تھی.....؟

اور کبھی کبھی شہباز احمد کی قربت میں اسے شہر یا ریاد آتا تو آئے چلا جاتا اور اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکاتے رہتے۔ اپنی محبت کی ناقدری پر اس کا دل روتا تو وہ پہروں جاگتی رہتی۔ بعض مرتبہ تو اسے برابر لیٹے شہباز احمد کا خوف بھی نہ ہوتا۔ شہر یا رکنا تصور اس قدر حاوی ہو جاتا۔



شہباز احمد نے آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ ماورا ان کے ہر طرح کے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ آفس جانے کے لئے انہیں تیار کرتی، انہیں گاڑی تک چھوڑتی، یہ اور بات کہ اس کی نظریں جھکی رہتیں اور بہت کم وہ شہباز احمد سے بات کرتی تھی۔ بس ان کے سوالوں کے جواب ہاں ناں میں دیتی اور کبھی کبھی شہباز احمد کا دل چاہتا، وہ اس سے کہیں۔

”تم بولتی کیوں نہیں ہو.....؟“

”تم ہنسی کیوں نہیں ہو.....؟“

”تم اس کے ساتھ بولتے ہو، ہنستے ہو، جو اس سے یہ خواہش کرتے ہو.....؟“

ان کے اندر بیٹھا ہونا صاف انہیں سرزنش کرتا۔

”مجھے تو میری محبت نے ختم کر ڈالا ہے، مار ڈالا ہے۔ کاش، ایسا نہ ہوتا تو میں ماورا

جیسی لڑکی کو پا کر کتنا خوش ہوتا۔ مگر میرے دل پر تو داغ ہے، اس محبت کا جسے میں نے بہت چاہا

مگر پانہ سکا۔“

کئی بار ان کا جی چاہتا، وہ ماورا سے بات کریں، وہ گھر فون بھی کرتے، مگر کوئی اور

اٹینڈ کرتا۔ تب وہ سلسلہ منقطع کر دیتے۔

لگتا تھا، ماورا کو تو ٹیلی فون کالز سے بھی دلچسپی نہیں ہے۔ کئی بار انہوں نے دیکھا تھا

کہ اس کے قریب ہی فون کی گھنٹی بجتی رہتی مگر وہ ریسپونڈ نہ کرتی۔ ایک بار انہوں نے کہا تھا۔

”ماورا.....! فون اٹھالیا کرو، کیا خبر آپ کا ہی فون ہو۔“

”میرا یہاں کون ہے جو فون کرے گا.....؟“

”آپ کے ابو امی کا بھی فون ہو سکتا ہے۔“

”جب ہوتا ہے تو کوئی بھی اٹینڈ کرے، بات ہو جاتی ہے۔“

وہ اتنی آہستگی سے بولتی کہ اس کے جملے بعض مرتبہ شہباز احمد کی سمجھ میں ہی نہ آتے۔

ان کی شادی کو سات ماہ گزر گئے تھے اور ماورا کو لگتا جیسے آج بھی وہ دونوں اتنے ہی

دور ہیں جتنے کے پہلے روز تھے۔ اس عرصے میں وہ یکے بھی صرف ایک بار گئی تھی۔ شہباز کی

نوکری نئی تھی۔ نہ انہیں فرصت ملتی تھی اور نہ ہی ماورا نے کبھی کہا تھا۔

اسے لگتا جیسے کوئی دلچسپی ہی نہ رہ گئی ہو۔ عجیب سے احساسات تھے۔ نہ شہباز احمد کی

محبت میں شدت تھی اور نہ جواباً اس کا رد عمل شدید ہوتا۔ اور یہ اچھا ہی تھا۔ دونوں ہی کی محبتوں

نے انہیں اپنے جذبات سے عاری کر ڈالا تھا۔

فائزہ آپا کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ امی رات سے وہیں تھیں۔ ساحرہ اور الطاف بھائی

بھی چلے گئے تھے۔ ابو ڈرائنگ روم میں شطرنج کی بساط بچھائے اپنے دوست تنویر کھوسہ کے

ساتھ بیٹھے تھے۔

ماورا شاہد لے کر نکلی تو فون بول پڑا۔ کبھی اس نے ان گزرتے سات ماہ میں فون

ریسیو نہ کیا تھا۔ اسے ایک انجانا سا خوف آتا تھا۔ اس کی گھنٹی بری لگتی تھی مگر اب تو مجبوری تھی۔

”ہیلو.....!“

نہایت کپکپاتی ہوئی آواز میں اس نے ہولے سے کہا۔ دوسری طرف شہباز احمد

تھے۔

مگر یہ کیا.....؟ ماورا کو لگتا جیسے اس کے ارد گرد پھل جھڑیاں ہی چھوٹ رہی ہوں۔ وہ

کہہ رہے تھے۔

”ذرا میرا سامان تیار کر دو۔ دو چار جوڑے بیک میں رکھ دو۔“

”اچھا.....!“

وہ بہت آہستہ بولی۔

”پوچھیں گی نہیں، کہاں جا رہا ہوں.....؟“

انہوں نے کہا تو ماورا جلدی سے ماؤ تھپیں میں بولی۔

”بتا دیں.....!“

”اسلام آباد جا رہا ہوں۔ ایک ضروری کام ہے، دو روز تک آ جاؤں گا۔ اُداس تو

نہیں ہوں گی.....؟“

شوخی سے پوچھا گیا۔ تب ماورا کا دل چاہا، کہہ دے۔

”پہلے تو اُداس نہ ہوتی مگر اب شاید ہوں۔“

”بتایا نہیں.....!“

”ہر جذبہ بتایا نہیں جاتا۔“

جھجک کر اس نے بات کی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ شہباز احمد بولتے رہیں اور وہ

یہ آواز سنتی رہے۔ پورے ایک سال بعد یہ آواز فون کے ذریعے اس کی سماعتوں میں اُتری تھی۔

وہ حیران کم اور پریشان زیادہ تھی۔

”میں پاس رہ کر بھی نہ پہچان پائی.....؟“

”لیکن تم نے کبھی شہباز کی باتوں پر غور ہی کب کیا.....؟ اس کے لیے پر کب غور

کیا.....؟“

ویسے بھی فون پر آواز اکثر بدل جاتی ہے اور ماورا کی تو سہیلیاں بھی اعتبار نہ کرتی

تھیں، جب اس سے فون پر بات کرتی تھیں۔ کیونکہ فون پر اس کی آواز بہت ہی نرم اور پتلی

ہوتی تھی۔

”تو شہباز احمد اسی لئے تم مجھے پہچان نہ سکے.....؟ یہ تو زبردست صورت حال ہے۔

مگر کیا خبر، مجھے دھوکہ ہوا ہو۔ میں جو شہباز کی آواز سننے کی خواہش مند رہتی ہوں، ایسا بھی تو ہو

سکتا ہے کہ میری سماعت نے وہی سنا ہو جو میں سننا چاہتی تھی۔“

لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا کہ شہباز احمد ہی شہباز ہے۔ جس طرح اس نے نام بدل

لیا تھا، شاید شہباز نے بھی ایسا ہی کیا ہو۔

”لیکن کس طرح پوچھوں.....؟ اگر شہباز ہی شیریں نہ ہوئے تو.....؟“

وہ دوسو سوں میں گھری ہوئی تھی اور شام کو وہ ساحرہ سے کہہ رہی تھی۔

”پہلے تم لوگ جھگ میں رہتے تھے.....؟“

”نہیں تو، کس نے کہا.....؟“

”لو جی.....! پہلا سوال ہی غلط نکلا۔“

ماورا گڑبڑا گئی۔

”ہم تو نہیں، پھپھورہتی ہیں۔ کیوں.....؟“

ساحرہ بولی۔

”ویسے ہی پوچھا تھا۔“

”شہباز نے گورنمنٹ کالج سے ایف ایس سی کیا تھا.....؟“

ماورا نے پوچھا۔

”ہوں.....!“

وہ آلو بخارے اڑاتی ہوئی بولی۔

”پھر.....؟“

وہ جاننا چاہتی تھی۔

”پھر یہاں ایڈمجن نہیں ملا تو کراچی چلے گئے۔ این ای ڈی یونیورسٹی سے بی اے

کیا ہے۔“

”اوہ.....!“

خوشی سے ماورا کا دل اُچھلا۔

”وہاں کس کے ہاں رہتے تھے.....؟“

”ہاسٹل میں رہتے تھے۔“

ساحرہ نے بتایا۔

”آپ سے معافی ہوئی تھی ناں، تبھی تو کراچی سے آئے تھے، فائل انکیزام دے کر،

مگر ماورا بھابی.....! پتا نہیں بھیا کو کیا ہو گیا ہے.....؟ بہت ہنس کھہ ہوتے تھے، اتنے سنجیدہ

ہو گئے ہیں کہ وہ شابی بھیا تو لگتے ہی نہیں، پتا نہیں کہاں کھو گئے ہیں.....؟“

”پہلے سنجیدہ نہیں تھے.....؟“

”نہیں.....! گھر میں ہنگامہ کئے رکھتے تھے اور امی ڈانٹا کرتی تھیں۔ اب تو کسی

سے بات ہی نہیں کرتے۔ آپ سے بھی زیادہ فریگ نہیں لگتے۔ امی بھی ایک روز کہہ رہی تھیں

”ابو سے۔“

”کیا.....؟“

ماورا نے پوچھا۔

”یہی کہ ماورا ڈری سہی رہتی ہے۔ شابی کا رویہ اس سے اچھا نہیں۔ ابو کہہ رہے تھے

کہ میں شابی کو سمجھاؤں گا۔ بھیا نے آپ کو کچھ کہا.....؟“

”نہیں تو.....! ویسے سارو.....! ایک بات تو بتاؤ.....! تم شابی کو کراچی فون کرتی

ہوگی.....؟“

ماورا نے پوچھا۔

”ہاں.....! بھیا کر لیتے تھے، نہ کرتے تو میں ہر ہفتے کرتی تھی۔“

”تو پھر ان کے کسی دوست سے پوچھو ناں، یہ سنجیدہ کیوں ہیں.....؟ جبکہ بقول

تمہارے پہلے ایسے نہیں تھے۔“

”کس سے پوچھوں.....؟“

ساحرہ بولی۔

”کوئی دوست تو ہوگا۔“

”بس بھیا کا ایک ہی دوست تھا، شہریار.....!“

ساحرہ بولی۔

”اب نہیں ہے دوستی.....؟“

”وہ تو ہائر اسٹڈی کے لئے اسٹینٹس چلے گئے ہیں، بھیا کی شادی میں بھی شرکت نہیں

کی۔“

”چلو، خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔“

ماورا کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ اس سے تو یہ خوشی سنبھالے نہ سنبھال رہی تھی۔ اسے

یقین تھا کہ شہباز احمد ہی شہریار ہیں اور اپنی خوشی میں اس نے صائمہ کو بھی شامل کر لیا تھا۔ اسے

کراچی فون کر ڈالا۔

صائمہ تمام تفصیل سننے کے بعد بولی تھی۔

”اب تم دوبارہ سے چکر چلاؤ۔“

”کیسے یار.....؟“

”دیکھو، گھر میں تم اس سے کم بولا کرو۔“

”وہ تو میں ویسے ہی بہت کم بولتی ہوں۔“

”کیوں.....؟“

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”اب نہیں ڈرو گی۔“

”شیری سے نہیں ڈروں گی۔“

”تمہیں آج بتا رہی ہوں کہ مجھے اس نے فون کیا تھا۔“

صائمہ نے انکشاف کیا۔

”اچھا.....!“

ماورا بولی۔

”ہاں.....! اور کہا تھا کہ بیلا کو پیغام دے دیجئے گا کہ اگر کورٹ میرج پر راضی ہو تو

مجھے ان نمبرز پر اطلاع دے دے، میں اسی وقت آ جاؤں گا۔“

صائمہ نے اسے فون نمبرز بتائے تو وہ دونوں ہی اس کی سسرال کے تھے۔ اب تو

شک کی گنجائش نہ تھی۔ دو روز بعد شہباز احمد اسلام آباد سے آ گئے تھے تو اسے دیکھ کر حیران رہ

گئے۔ وہ خاصی کھلی کھلی اور نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ انہوں نے کچھ بھی نہ پوچھا۔ تھکے

ہوئے تھے، پڑ کر سو رہے۔ شام کو کچھ دوست آ گئے تو ان کے ساتھ چلے گئے۔ جب رات کو گھر

آئے تو ماورا سو چکی تھی۔ انہیں افسوس تو ہوا کہ بیوی سے کوئی بات نہ کر سکے تھے مگر کیا کرتے کہ

خود پر جبر کر کے وہ بھی تھک سے گئے تھے۔ روح بوجھل سی ہو جاتی تھی۔

”پتا نہیں زندگی کا اتنا لمبا سفر کیسے گزرے گا.....؟ آخر اس کا کیا دوش.....؟“

خراب تو نصیب اپنے تھے۔ وہ یہی سوچے ہوئے نیند کی آغوش میں اتر گئے۔



رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی

جیسے دیرانے میں چپکے سے بہار آ جائے

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم

جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

شہباز احمد نے فائل پر نظریں جمائے جمائے ہی بجتے فون کا ریسور اٹھالیا۔

”ہیلو.....!“

اپنی مخصوص بھاری آواز میں وہ بولے۔

”ہیلو.....! ہیلو جی.....!“

”بب..... بیلا.....؟“

بے ساختہ ہی ان کے ہونٹوں سے یہ نام پھسلا تھا۔

”ارے.....! اتنی جلدی پہچان لیا.....؟“

وہ ہنسی۔

”تمہیں کہا تھا ناں کہ تمہاری آواز تو میں لاکھوں میں بھی پہچان سکتا ہوں، مگر تم ہو

کہاں.....؟ کیسی ہو.....؟“

”کہاں ہوں.....؟ اسی شہر میں۔ کیسی ہوں.....؟ بہت اچھی، بہت خوب صورت،

بہت خوش.....!“

”لگ رہا ہے تمہاری آواز سے۔“

وہ بولے۔

”تم خوش نہیں ہو.....؟“

”تمہارے بعد تو خوشیاں ہی روٹھ گئیں۔“

”جھوٹ.....! مگر خوب صورت جھوٹ اب بھی بولتے ہو۔“

”تم اب تک نہیں بدلیں۔“

”تم نے چاہا تھا، میں بدل جاؤں۔“

”کیا کر رہی ہو آج کل.....؟“

”بچے نہیں پال رہی۔“

اپنے بے ساختہ پن سے وہ بولی تو شہباز احمد ہنس دیئے اور ایک دم حیران رہ گئے۔

عرصے بعد وہ اس طرح ہنسے تھے۔ لگتا تھا، ہنسنا ہی بھول گئے ہوں۔

”بیلا.....! تم بہت خفا تھیں ناں.....؟“

وہ پوچھ رہے تھے۔

”خفا ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں تھی۔“

وہ بولی۔

”پہلے یہ بتاؤ.....! تم نے یہ فون نمبر کہاں سے لیا.....؟“

وہ جاننا چاہتے تھے۔

”دیکھ لیں، تلاش کر ہی لیا۔“

”بتاؤ ناں یار.....!“

وہی بے تکلفی، لگتا نہ تھا کہ ایک سال کا سمندر بھر دونوں کے درمیان حائل رہا۔

”صائمہ کو تم نے فون نمبر زد دئے تھے ناں، اس نے مجھے کل ہی یہ نمبر دیا تھا تمہارے

گھر کا۔“

”ہاں.....! ہاں پھر.....؟“

”آج میں نے تمہارے گھر فون کیا تھا تو انہوں نے آفس کا نمبر دے دیا۔“

”مگر میرا نام.....؟“

”جناب.....! میں نے بھی گیم کھیلا۔ کسی خاتون نے ہی ریسو کیا تھا، میں نے کہا،

مجھے شہر یار سے بات کرنی ہے تو کہنے لگیں، آپ کون.....؟ میں نے کہا، مسز شہر یار.....!“

”اچھا.....!“

وہ ہنسا۔

”تو وہ خاتون ہنس دیں۔ کہنے لگیں یوں کہو کہ شہباز سے بات کرنی ہے۔ شہر یار

نے کب شادی کی، وہ شادی کی شادی پر نہیں آیا تو اپنی شادی پر بھی نہیں بلایا۔ آئے تو کان کھینچوں

گی۔ پھر انہوں نے مجھے تمہارے آفس کا نمبر دے دیا۔“

”بہت چالاک ہو، ذرا نہیں بدلیں۔“

”تم کیا چاہتے ہو، میں بدل جاتی.....؟ تمہاری بے وفائی کا سوگ مناتی اور سنی

ٹوریم میں پڑی ہوتی۔“

”خدا نے کرے.....!“

وہ جلدی سے بولا۔

”ویسے تم اب یہ بتاؤ کہ میں تمہیں شیری کہوں یا شابی.....؟“

”یار.....! شہر یار میرا روم میٹ تھا۔ بس اس کے نام پر فون میں کرتا تھا۔“

”جن رشتوں میں ابتداء ہی جھوٹ سے ہو، وہ پختے نہیں شہباز احمد.....!“

”میری بات سنو بیلا.....! قسم سے مجھے علم نہیں تھا کہ مذاق زندگی کا روگ بن جائے

گا۔“

”لڑکیوں سے ایسے مذاق کرنے کی ضرورت کیا ہوتی ہے.....؟“

”مجھے کیا معلوم تھا کہ انجوائے منٹ روگ بن جائے گی۔ تم جیسی چاہو قسم لے لو،

جب سے تم پھڑکی ہو، میں کھل کر ہنسا بھی نہیں ہوں۔“

”ظاہر ہے.....! تمہارے ضمیر پر بوجھ تھا کہ تم نے میری سادگی سے ناجائز فائدہ

اٹھایا۔“

”نہیں بیلا.....! تمہاری سادگی نے تو میرے دل کو تمہارا اسیر کیا۔ تمہاری سادگی اور

بے ساختہ پن نے تو میرے دل میں تمہاری محبت اُتاری۔ بغیر دیکھے بھالے میں نے تمہیں اتنا

چاہا کہ خود کو بھلا بیٹھا۔“

”تمہاری بیوی کیسی ہے.....؟“

اس نے پوچھا۔

”بہت اچھی ہے، مگر.....“

”مگر کیا.....؟“

”اب تک وہ میرے دل میں نہیں اتر سکی۔“

”خوب صورت نہیں ہوگی۔“

”بہت خوب صورت ہے۔“

”مجھے جیلس کر رہے ہو۔“

”یہ بات نہیں.....! میں بتا رہا ہوں کہ اس کی خوب صورتی بھی میرے دل میں اس

کے لئے کوئی جگہ نہیں بنا سکی۔ سچ بیلا.....! اس کی قربت میں تم بہت یاد آتی ہو۔ میں اس سے

کبھی بھی انصاف نہیں کر سکتا۔“

”نہ کرو، بس مجھ سے محبت کرتے رہو۔“

وہ بولی۔

”وہی تو کر رہا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔“

شہباز احمد کے لہجے میں جذبے کوک رہے تھے۔

”اچھا شابی.....! پھر بات ہوگی۔“

”کب.....؟“

وہ بے چین ہو گیا۔

”جب موقع ملا۔“

”مجھے خبر دو، میں کر لوں گا فون۔“

”کوئی ضرورت نہیں.....! میں خود رابطہ کروں گی۔“

”ایک بات تو بتاؤ.....! کیا تمہاری شادی ہوگئی.....؟“

”تم شادی کر سکتے ہو تو کیا میری نہیں ہو سکتی تھی.....؟“

”اوہ.....!“

شہباز کی آہ نکل گئی۔

”مت ٹھنڈی سانسیں بھرو۔ نہیں ہوئی میری شادی، اپنے جیسا سمجھ رکھا ہے۔“

”اوہ بیلا.....! تم نے مجھے نئی زندگی دے دی ہے سویت ہارٹ.....!“

شہباز کو لگا تھا جیسے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔

”اب ہیرومت بنو.....!“

اس نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر ڈالا۔

ماورا بہت خوش تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے آج ایک نئی ماورا نے جنم لیا ہو۔ سہ پہر کو جب شہباز احمد گھر آئے تو وہ ان کے چہرے پر خوشی کی لہر دیکھ کر مطمئن تھی مگر اس نے خود کو دیا ہی رکھا جیسی گزرے سات ماہ سے رہ رہی تھی۔

اب تو روز ہی وہ بیلا بن کر شہباز احمد سے گفتگو کرتی تھی اور شہباز احمد نے جو باتیں کبھی اس سے خلوت میں بھی نہ کی تھیں، وہ ”بیلا“ بنی ماورا سے کرتے اور وہ ہنستی رہتی۔ دن پتکے لگا کر اڑ رہے تھے۔ شہباز احمد کی ضد تھی کہ وہ اس سے ملنا چاہتے ہیں اور وہ انکار کر دیتی۔

”یار.....! پہلے بھی تمہاری اسی عادت نے عذاب میں مبتلا کیا تھا۔ اب تو مل لو، میں کھا نہیں جاؤں گا۔“

”میں کوئی گلاب جامن ہوں جو تم مجھے کھاؤ گے۔“

وہ بولی۔

”لگتا تو یہی ہے، بہت میٹھی ہوناں.....!“

شہباز احمد شوخ ہو گئے۔

”کتنا خوب صورت موسم ہے، آج ساون کی پہلی بارش ہوئی ہے۔ چلو راوی چلتے

ہیں۔“

”تم اپنی بیوی کو لے جاؤ ناں.....!“

”مجھے اس سے اتنی محبت ہوتی تو ضرور لے جاتا۔ آئی سمجھ.....؟“

”نہ ہو محبت، دنیا دکھا دو تو ہے ناں.....؟“

”وہ آج کل مصروف ہے۔“

”کیا نئے مہمان کی آمد ہے.....؟“

”تمہاری زبان نہیں رککتی.....؟“

شہباز ہنس دیئے۔

”بھئی.....! عورتوں کو ایسی ہی مصروفیات گھیر لیتی ہیں، شادی کے بعد۔“

”ایسی بات نہیں ہے، آئندہ ہفتے ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔“

”اوہ.....! تو یہ عیش ہیں، ابھی بیوی پسند نہیں، محبت نہیں۔“

وہ غصے سے بولی۔

”یار.....! وہ میری بہنیں وغیرہ اہتمام کر رہی ہیں ورنہ مجھے خوش شوق نہیں ہے۔“

شہباز احمد نے وضاحت کی۔

”بس رہنے دو.....! دیکھ لی تمہاری محبت۔ آئندہ میں نے تم سے بات نہیں کرنی۔“

غصے سے ماورا نے فون بند کر ڈالا اور شہباز احمد ”ہیلو ہیلو“ کرتے رہ گئے۔ ماورا

خوش ہوتی رہی۔ پھر اس نے شہباز احمد کو فون نہ کیا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ شہباز احمد اُلجھے اُلجھے

اور پریشان رہتے ہیں۔ کوئی فون آتا تو چیل کی طرح جھپٹ کر ریسیور اٹھاتے اور پھر ان کے

ارمانوں پر اوس پڑ جاتی۔ اور ماورا ان کی کیفیت پر ہنستی رہ جاتی۔ اس روز ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی۔ وہ آفس جانے کے لئے تیار ہوئے تو ماورائے آہستہ سے کہا۔

”آج آپ آفس نہ جائیں۔“

”کیوں.....؟“

وہ ابرو چڑھا کر بولے۔

”آج ہماری شادی کی.....“

ماورائے کہنا چاہا تو وہ بات کاٹ کر بولے۔

”ہوتی رہے سالگرہ، مجھے ضروری کام ہے اور یوں بھی فنکشن تو شام کو ہوگا۔ زیادہ

لوگوں کو تو نہیں بلایا۔“

”بس گھر کے لوگ ہیں۔“

”ٹھیک ہے.....!“

”جلد آجائے گا۔“

ماورائے کہا۔

”دیکھوں گا۔“

شہباز احمد نے نہایت بے اعتنائی سے کہا تھا اور چلے گئے تھے۔ ماورا ان سے نہ بحث کرتی تھی نہ اونچا بولی تھی کہ مبادا آواز پہچان لیں۔ ویسے بھی وہ فون پر ان سے جب بھی بات کرتی، ماؤتھ پیس پر رومال رکھ لیتی تھی اور شہباز احمد نے تبدیلی کبھی محسوس ہی نہ کی تھی۔ وہ تو آواز سن کر خوش ہو جاتے تھے۔

ایک دم ہی بارش تیز ہو کر مدہم ہو جاتی تھی۔ شہباز احمد نے کھڑکی کے پردے ہٹوا دیئے تھے اور باہر کا منظر ایسے میں نہایت دلکش تھا۔ تبھی بیلا کا فون آگیا۔

”اتنے دن سے کہاں تھیں.....؟“

بے قراری لہجے سے عیاں تھی۔

”خود کو سمجھا رہی تھی۔“

وہ بولی۔

”کیا.....؟“

انہوں نے پوچھا۔

”تم سے تعلق رکھوں یا توڑ ڈالوں.....؟“

”پھر.....؟“

وہ مسکرائے۔

”میں تم بن نہیں رہ سکتی شابی.....! تم میرے دل کی مجبوری ہو۔ آج اتنا حسین موسم

ہے ناں شابی.....!“

”ہاں.....!“

انہوں نے کہا۔

”کھومنے چلیں جانو.....!“

”زہے نصیب.....! میں تو کب سے تمہارا ساتھ چاہ رہا ہوں۔“

”مجھے گھرے بھی لے کر دینا۔“

”پھر آ جاؤں ناں.....؟“

”کہاں آؤ گی.....؟“

”تمہارے آفس.....!“

”یار.....! باہر ملتے ہیں۔“

”تم ڈر رہے ہو.....؟“

”یہ بات نہیں ہے، تم مجھے جگہ بتا دو، میں پک کر لوں گا۔“

”میں تمہارے آفس آؤں گی۔“

”کتنے بجے.....؟“

”پانچ بجے.....!“

”ابھی تین بجے ہیں، ٹھیک ہے، میں منتظر ہوں۔“

شہباز احمد نے کہا تھا۔ آج وہ اتنے خوش تھے کہ لگتا تھا، اقلیم کی دولت ملنے والی ہو۔



”امی جان.....! میں شابی کے آفس جا رہی ہوں۔“

ماورا نے کہا۔

”کیوں.....؟“

انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”شبابی نے گاڑی درک شاپ بھیج دی ہے۔ کہہ رہے تھے کہ میں ڈرائیور کے ساتھ آ جاؤں۔ ذرا پارلر جاؤں گی پھر ہم ایک بھی لیتے آئیں گے۔“

”ٹھیک ہے.....!“

بیگم قادر نے اپنی جی سنوری بہو کی بلائیں لیں جو سبز لہنگا اور خوب لمبے کُرتے میں نہایت خوب صورت لگ رہی تھی۔ بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ گھر سے چل تو پڑی تھی لیکن پریشان بھی تھی کہ شہباز احمد جب دیکھیں گے تو کہیں معاملہ اُلٹ نہ ہو جائے۔

”نہیں طلاق نہ دے دیں کہ میں انہیں بے وقوف بناتی رہی۔ چلو، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

سر جھٹک کر اس نے ذہن کو کھلا چھوڑ دیا۔ ڈرائیور اسے شہباز احمد کے آفس کے باہر ہی چھوڑ کر کار میں جا بیٹھا تھا۔ ماورا دروازہ ناک کر کے اندر داخل ہوئی تو شہباز احمد کھڑکی میں کھڑے تھے اور اس کی جانب ان کی پشت تھی۔

”ٹوئچ لیٹ.....! پانچ بجے کا کہا تھا اور اب پونے چھ ہو رہے ہیں۔“

شہباز احمد نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”کس کا انتظار تھا.....؟“

ماورا نے اپنے لہجے کو نرم بنا کر کہا تو وہ ایک دم ہی پلٹے اور اپنے سامنے کھڑی ماورا کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے۔

”تت.....تم.....؟ یہاں.....؟“

”جی.....! یہ میرے شوہر کا آفس ہے۔“

ماورا نہایت اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی ہمت پر شہباز احمد حیران تھے۔

”تم یہاں کیوں آئی ہو.....؟“

”آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ آپ کو لینے آئی ہوں۔“

وہ ذرا پریشان نہ تھی۔

”میں نے گھر نہیں آنا تھا کیا.....؟“

وہ کھا جانے والے انداز میں بولے۔

”کیا خبر، نہ آنا ہوتا، تبھی تو اب تک آفس میں ہیں۔“

”ماورا بیگم.....! چلی جاؤ یہاں سے۔“

”کیوں چلی جاؤں.....؟“

وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ یہاں ایری غیری کا انتظار کریں اور میں چلی جاؤں.....؟ آئے تو دیکھتی ہوں، کیسے آتی ہے، آپ کی محبوبہ یہاں.....؟“

وہ مشکل سے ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”تم بیوی ہو، بیوی بن کر رہو.....!“

وہ گر بجے۔

”بیوی محبوبہ نہیں ہو سکتی.....؟“

”شٹ اپ.....!“

”آپ کی بیلا نہیں آئے گی یہاں۔“

”تمہیں کیسے پتا.....؟“

انہوں نے پوچھا۔

”میں نے اسے مار ڈالا ہے شہباز احمد.....!“

”کیا.....؟ تم نے اسے قتل کر ڈالا.....؟“

”ہاں.....!“

ماورا آگے بڑھی۔

”کیوں.....؟“

وہ حیران تھا۔

”وہ مجھ سے میرا شوہر چھین لے اور میں اسے کچھ نہ کہوں جانو.....؟“

ماورا اس کے قریب ہو گئی۔

”جج..... جانو.....؟“

حیرت کا ایک جھٹکا سا شہباز احمد کو لگا تھا۔ تب ماورا نے اس کے کندھے سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

”شابلی.....! بیلا تو شیریں کو چاہتی تھی، ماورا نے تو صرف شہباز احمد کو چاہا ہے، اور..... اور شابلی.....! بہت دل چاہتا تھا آپ کے کندھے پر سر ٹکانے کو، بے شک آپ شیریں تھے اور ماورا، بیلا بنی ہوئی تھی۔ خواہشیں یوں ہی اودھم مچاتی تھیں۔ مجھے معاف کر دیں شابلی.....!“

”تم ہی بیلا ہو.....؟“

شہباز احمد نے اسے شانوں سے پکڑ کر اپنے مقابل کر لیا۔

”بیلا تھی، اب صرف ماورا شہباز احمد ہوں۔“

”اوہ گاڈ.....! تم میرے اتنے قریب تھیں اور میں تمہیں تلاش کرتا رہا.....؟ کھوجتا

رہا.....؟ جانو.....! تم مجھے تڑپاتی رہی۔“

شہباز احمد نے اسے لپٹا لیا۔

”تم میری محبت، میری سستی، میری ہیر، میری بیلا.....!“

”ناٹ بیلا.....! صرف آپ کی ماورا.....!“

اس نے شہباز احمد کے لبوں پر انگلی رکھ دی اور وہ مسکرا دیئے۔

”چلیں، ابھی ایک بھی لینا ہے۔“

”مجھے سب کچھ بتاؤ تو.....!“

وہ جاننا چاہتے تھے۔

”گھر چل کر بتا دوں گی، آج ویسے بھی ہم سوئیں گے تو نہیں ناں.....!“

وہ شرارت سے بولی۔

”بہت بدتمیز ہو.....!“

شہباز احمد ہنس کر بولے تو وہ جلدی سے بولی۔

”میرا مقصد ہے کہ ڈھیر ساری باتیں کریں گے، ہجر کے قصے سنائیں گے۔“

”میرا تو کوئی ہجر کا قصہ سنانے کا پروگرام نہیں ہے۔“

شہباز احمد شریر ہو گئے۔

”میرا تو ہے۔ میں تو سناؤں گی۔“

وہ ایک ڈھینٹ لڑکی تھی۔

”چلیں بھی.....!“

”مجھے رنج کے تو خود کو دیکھنے دو۔“

وہ ٹٹار ہو رہے تھے۔

”عمر بڑی ہے دیکھنے کو.....!“

”بہت تھوڑی ہے یہ عمر.....!“

وہ بولے۔

”تم نے تو ابھی ایک عمر اور لینی ہے خدا سے۔“

اس نے یاد دلایا۔

”بس یہی کافی ہے، تم جیسی آفت کے ساتھ یہی اچھی گزر جائے تو۔“

شہباز احمد تو کھلے جارہے تھے۔ آج وہ ان کا نیا روپ دیکھ رہی تھی۔ بارش اب بھی

ہو رہی تھی مگر شہباز احمد اسے شاپنگ کراتے پھر رہے تھے۔ واپسی پر انہوں نے اس کے لئے

ڈھیر سارے گجرے لئے تھے۔ پھولوں کے گہنے لئے تھے اور کہہ رہے تھے۔

”آج اچھی طرح تیار ہونا۔“

”کیوں.....؟“

وہ اتر کر بولی۔

”تمہیں جی بھر کے دیکھوں گا۔“

”تم نے میرا گھونگھٹ بھی اُلٹا نہ تھا۔“

اس نے یاد دلایا۔

”آج سارے قرض چکا دوں گا۔“

شہباز احمد کا لہجہ شوخ تھا اور وہ لاج و نقی کے پودے کی طرح سمٹ گئی۔ یہ ساون ان

دونوں کے لئے محبتوں کا خزانہ لے کر آیا تھا، جس کی ٹھنڈی ٹھنڈی پھواروں سے وہ دونوں

اکٹھے ہی بھیگ رہے تھے اور دل کے آنگن میں محبتوں کا ساون برس رہا تھا۔

